* اسلام اور سیاسی نظریات ـــــ محمد تقی عثمانی (مؤلف) / مکتبہ معارف القرآن - کراچی / نومبر ۲۰۱۰ء / ۴۲۳ صفحات / مجلد مع گرد پوش، قیمت درج نہیں۔

اسلامی معاشرے کو درپیش تحدّیات اور مشکل مسائل کا حل وہی اہلِ علم و نظر پیش کر سکتے ہیں جو قرآن و سنت پر گہری نظر رکھنے کے ساتھ مروجہ سماجی علوم سے بخوبی واقف ہوں۔ سماجی علوم معاشرے اور اِس کے اداروں کو سمجھنے میں مدد دیتے ہیں، مسائل و مشکلات کے ادراک میں معاون ثابت ہوتے ہیں، اور ان سے حاصل شدہ تفہیم و ادراک سے قرآن و سنت کے نفاذ میں آسانی پیدا ہو جاتی ہے۔ ماضی کے سربرآوردہ اسلاف کی میراثِ مکتوب سے یہ بات بڑی واضح ہے کہ وہ قرآن و سنت کے عالم تو تھے ہی، اس کے ساتھ وہ مروجہ علوم میں بھی مہارتِ تامہ کے مالک تھے۔ علامہ فخر الدین رازی (م ۱۲۱۰ء) کی تفسیر

Scanned by CamScanner

''مفاتیح الغیب'' (جو ''تفسیرِ کبیر'' کے عمومی نام سے متعارف ہے) کے بارے میں کسی کا یہ چلتا ہوا جملہ پڑھنے میں آتا ہے کہ اِس میں سب کچھ ہے سوائے تفسیر کے۔ واقعیت کے اعتبار سے، اگرچہ اِس جملے میں زیادہ وزن نہیں، تاہم اِس سے علامہ رازی کے حیطۂ علم و دانش کا پتا چلتا ہے کہ اُنہوں نے اپنے عہد کے مروجہ علوم فلسفہ و منطق، ہیئت، جغرافیہ اور تاریخ وغیرہ سے بھرپور استفادہ کیا تھا۔

نوآبادیاتی دور میں دینی اور دنیوی تعلیم کے درمیان پیدا ہونے والی خلیج کے نتیجے میں ہمارے ہاں یہ صورت پیدا ہوگئی ہے کہ دینی مدارس کے نصاب میں سماجی علوم کا بحیثیت مجموعی کوئی گزر نہیں، اور دنیوی جامعات کے نصابات میں سماجی علوم کے ساتھ قرآن و سنت اور صدیوں پر محیط مسلم روایت کو آمیز کرنے کی کاوشوں میں وہ پیش رفت نہیں ہوسکی جس کی توقع کی جارہی تھی، تاہم دینی مدارس اور دنیوی جامعات میں جو اصحابِ نظر دین اور دُنیا کی اِس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کررہے ہیں، ان میں دینی مدارس کے حوالے سے ''دارالعلوم-کراچی'' کے منتظمین شامل ہیں۔ ایک عرصہ پہلے ''دارالعلوم'' کے ذمہ داروں کی دعوت پر مرحوم محمد حسن عسکری نے طلبہ کو جدیدیت اور اِس کے چیلنجوں سے متعارف کرانے کے لیے ایک مختصری کتاب ''جدیدیت یا مغربی گمراہیوں کی تاریخ کا خاکہ'' (اشاعت اوّل: ۱۹۷۹ء) لکھی تھی، واللہ اعلم اِس کتاب، یا اِس پر نقد و نظر کے حوالے سے ''دارالعلوم'' کے کارپردازوں کا کیا زاویۂ نظر رہا، تاہم اس سے اہلِ ''دارالعلوم'' کی اِس خواہش کا بخوبی اظہار ہوتا ہے کہ وہ اپنے منتہی طالب علموں کو ''جدید'' سے متعارف دیکھنا چاہتے ہیں۔ ''جدیدیت'' جیسی نصابی کتابوں کی تدوین کے ساتھ ''دارالعلوم'' میں مختلف ضرورتوں کے تحت منتخب موضوعات پر تعلیمی دورے بھی منعقد کیے گئے ہیں۔ ایک دورہ معاشیات کے تعارف پر ہوا، جس میں جناب مفتی محمد تقی عثمانی نے فریضۂ تدریس انجام دیا، اور اُس دورے کا حاصل ''اسلام اور جدید معیشت و تجارت'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اِس کے بعد سیاسیات کے موضوع پر دوسرے دورے کا اہتمام صفر ۱۴۱۶ھ/ جولائی ۱۹۹۵ میں کیا گیا، جس کی تقاریر ''اسلام اور سیاسی نظریات'' کی شکل میں ہمارے پیشِ نظر ہیں۔ عنوان کتاب کی وضاحت کے لیے سرورق پر مزید لکھا گیا ہے: ''عہد یونان سے موجودہ دور تک کے سیاسی نظریات کا جائزہ، اسلامی اصول سیاست کی مدلّل تشریح اور ان کے عملی نفاذ کا طریقِ کار''

Scanned by CamScanner

کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ جناب عثمانی کے الفاظ میں ''پہلے حصہ کا مقصد علم سیاست، اِس کے مختلف نظریات کے تحت قائم ہونے والی حکومتوں کا تعارف ہے، (لیکن اس کے ساتھ جہاں ضروری معلوم ہوا، اسلامی نقطۂ نظر سے ان پر تنقید و تبصرہ بھی کیا گیا ہے)۔--- دوسرا حصہ سیاست سے متعلق اسلامی احکام اور تعلیمات پر مشتمل ہے، اور اِس میں فقہاء امت اور متکلمین کے مختلف نقطہ ہائے نظر بھی بیان کیے گئے ہیں۔ (''پیش لفظ''، صفحات ی- ک)

جناب عثمانی کی یہ کاوش اِس لحاظ سے تو از حد خوش آیند ہے ہی کہ ''دارالعلوم-کراچی'' کی فضا میں جدید علوم سے آگاہی کی خواہش موجود ہے، تاہم ایسی تصنیفات کو نصاب کا جز بنانا بھی ضروری ہے، تاکہ سندِ فضلیت حاصل کرنے والا ہر عالم جدید سماجی علوم کے مالہٗ وماعلیہ سے متعارف ہو، اور اِن علوم کی اہم تصنیفات سے واقف ہو، تاکہ عملی زندگی میں اپنے طور پر اِن علوم کا حسبِ ضرورت مطالعہ کرتا رہے۔

سیاسیات کے مختصر تعارف کے بعد حصہ اوّل میں اِن چار ابواب کے تحت عثمانی صاحب نے اپنا حاصل مطالعہ پیش کیا ہے: • ریاست کیسے وجود میں آئی؟ • مختلف نظام ہائے سیاست • جمہوریت-نظریاتی پہلو • جمہوریت کے عملی نظام۔

پہلے باب ''ریاست کیسے وجود میں آئی؟'' کے تحت ریاست کے آغاز کے بارے میں نظریۂ معاہدہ عمرانی، نظریۂ تخلیقِ ربانی، نظریۂ قوت اور نظریاتِ مادرسری و پدرسری کی وضاحت کی گئی ہے۔ دوسرے باب میں حکومت کی مختلف اقسام (نیز ان کی ذیلی اقسام)— بادشاہت، اشرافیہ اور آمریت وغیرہ— کا ذکر کیا گیا ہے۔ اشرافیہ کے تحت مذہبی اشرافیہ، اور آخر الذکر میں مسیحی اشرافیہ (تھیوکریسی) پر نسبتاً تفصیل سے گفتگو کی گئی ہے۔ تیسرے باب میں جمہوریت کے فلسفے، اِس کی مقبولیت میں دخیل تاریخی عوامل اور جمہوری اداروں کے قیام کا ذکر کیا گیا ہے۔ اِسی ضمن میں سیاسی جماعتوں کے وجود، انتخابات، مقنّنہ، دستور اور بنیادی حقوق کا بالاختصار ذکر کیا گیا ہے۔ چوتھے باب ''جمہوریت کے عملی نظام'' میں برطانیہ، امریکہ، فرانس اور سوئٹزرلینڈ کے جمہوری نظاموں کا تعارف دیا گیا ہے، اور آخر میں چند صفحات میں نیشنلزم پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

سیاسیات کے تعارف کے لیے مذکورہ مباحث ضروری تھے، مگر بعض دوسرے اہم مباحث توجہ

Scanned by CamScanner

حاصل نہیں کر سکے جو اسلامی تصورات کی تفہیم کے لیے ناگزیر ہیں، مثال کے طور پر ریاست اور اس میں اقتدارِ اعلیٰ کا تصور، آزادی اور مساوات، بین الاقوامی اداروں میں اسلامی ریاست/ریاستوں کی شمولیت اور بین الاقوامی اداروں کے منظور کردہ قواعد اور قوانین کی پاس داری، اور ریاست کے دائرۂ عمل کی وضاحت وغیرہ۔

حصہ دوم (اسلام کے سیاسی اصول) کے چھے ابواب کے عنوانات یہ ہیں: • اسلام اور سیاست کا باہمی تعلق • حکومت کا اسلامی تصوّر • حکومت سازی کے اصول • حکومت چلانے کے اصول • دفاع اور امورِ خارجہ • حکومت کی معزولی۔ ان ابواب کی ورق گردانی کرتے ہوے قاری یہ محسوس کرتا ہے کہ جناب عثمانی نے قرآن وحدیث، فقہی سرمایے اور اسلاف کی کتبِ تاریخ وسیاست کے بجا طور پر حوالے دیے ہیں، مگر عہدِ حاضر میں جناب عثمانی کے جن متقدم اہلِ علم نے اسلامی اصولِ سیاست کی تفہیم وتشریح میں دورِ جدید کے نظریات کے بارے میں آراء قائم کیں، اور اُن کی آراء کو کم وبیش پذیرائی بھی حاصل ہوئی، اُنہیں سرے سے نظرانداز کر دیا گیا ہے۔

عثمانی صاحب نے ''اسلام میں سیاست کا مقام'' کے تحت موجودہ افراط وتفریط کا ذکر بایں الفاظ کیا ہے کہ ''بعض دینی حلقوں نے--- نہ صرف خود اپنی سرگرمیوں کا سارا محور عقائد وعبادات اور زیادہ سے زیادہ اخلاق کی درستی کی حد تک محدود رکھا [ہے]، بلکہ جو لوگ اِس دائرے سے باہر جا کر کسی قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں مصروف ہوے، اُن پر تنقید بھی کی کہ ایک دیندار آدمی سیاست میں کیوں ملوث ہو؟'' (ص ۱۶۲)۔ دوسری طرف بعض افراد نے ''سیاست ہی کو اسلام کا مقصودِ اصلی قرار دے دیا، یعنی یہ کہا کہ اسلام کا اصل مقصد ہی یہ ہے کہ دُنیا میں، ایک عادلانہ سیاسی نظام قائم کیا جاے اور اسلام کے باقی سب احکام اِس مقصودِ اصلی کے تابع ہیں، لہٰذا جو شخص سیاست کے میدان میں دین کی سربلندی کے لیے کام کر رہا ہے، بس وہ ہے جس نے دین کے مقصودِ اصلی کو پالیا ہے اور جو لوگ سیاست سے ہٹ کر اصلاحِ نفس، تعلیم، تبلیغ یا اصلاحِ معاشرہ کے کاموں میں لگے ہوے ہیں، اور سیاست میں اُن کا کوئی کردار نہیں ہے، وہ گویا تنگ نظر اور دین کے اصل مقصد سے غافل ہیں۔'' (ص ۱۶۳) —— بطور خلاصہ لکھا گیا ہے کہ

Scanned by CamScanner

''دین میں سیاست کی اہمیت اپنی جگہ ہے، لیکن اُس کو دین کا اصل مقصود قرار دینے سے اولیات اور ترجیحات کا پورا نظام بُری طرح متاثر ہوتا ہے۔'' (ص ۱۷۰)

اِس کے ساتھ دوسری بنیادی بات جناب عثمانی نے یہ کہی ہے: ''سیاست کے بارے میں اسلام نے بے شک بہت سے احکام عطا فرمائے ہیں، لیکن حکومت کا کوئی تفصیلی نقشہ اسلام نے متعین نہیں فرمایا۔ اصول اور قواعد عطا فرمائے ہیں، لیکن اِن اصولوں کو کس طرح نافذ کیا جائے؟ اور عملاً اِن کی صورت کیا ہو؟ اِس کی تفصیلی جزئیات اسلام نے متعین نہیں فرمائیں، بلکہ اُن کو ہر دور کے اہلِ علم اور اہلِ بصیرت کے فیصلے پر چھوڑ دیا ہے'' (ص ۱۷۱)۔ مزید لکھا گیا ہے: ''اسلام کے احکامِ سیاست کا [یہ] حُسن ہے کہ اس میں چند بنیادی اصول متعین فرما کر تفصیلات ہر دور کے اہلِ بصیرت پر چھوڑ دی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اسلام کے احکام نہ کسی ایک خطے سے مخصوص ہیں، نہ کسی ایک زمانے سے۔ اس کے احکام قیامت تک آنے والے تمام حالات اور تمام خطوں کے لیے واجب العمل ہیں۔'' (ص ۲۵۰)

جناب عثمانی نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت (اقتدارِ اعلیٰ) اور اسلامی حکومت کے مقاصد پر روشنی ڈالی ہے۔ تشکیلِ حکومت کے سلسلے میں امیر کی صفاتِ اہلیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اُن تمام صفات پر گفتگو کی ہے جو ماوردی (م ۱۰۵۸ء) کے دور سے لے کر آج تک بیان کی جاتی رہی ہیں، اِسی ضمن میں امیر کے لیے ''قرشیت'' کی شرط پر بحث کی گئی ہے (صفحات ۲۱۵-۲۲۲)۔ امیر کے لیے شرطِ قرشیت کو لازمی قرار دینے والوں، اور اس سے اختلاف رکھنے والوں کی آراء کا ذکر کرنے کے بعد بطور حاصل بحث لکھا گیا ہے: ''اِس میں شک نہیں کہ علماء، فقہاء اور متکلمین کی بھاری اکثریت اِسی بات کی قائل ہے کہ خلیفہ کا قریشی ہونا ضروری ہے، لیکن یہ شرط اس وقت ہے جب قریش میں اُن دوسری صفات [عقل و بلوغت، ایمان، رجولیت، علم، عدالت] والا آدمی موجود ہو جو امیر کے لیے ضروری ہیں، اور اگر قریش میں ایسا عالم اور عادل آدمی میسر نہ ہو تو پھر اِس صورت میں اِس پر اتفاق ہے کہ غیر قریشی کو امیر بنانا جائز ہے اور احادیث سے بھی یہی معلوم ہوتا

Scanned by CamScanner

ہے۔'' (ص ۲۲۱)

اگر شرطِ قرشیت کو بنیادی اہمیت دی جائے تو کیا ایک قبیلے/گروہ کو ہمیشہ کے لیے حاکم اور باقی مسلمانوں کو ہمیشہ کے لیے محکوم بنا دینا اسلام کے تصورِ مساوات کے مطابق درست ہوگا؟ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد الائمة من قریش حالات پر مبنی ایک مشورہ تھا، یا ابدی حکم! اِس پر زیادہ توجہ نہیں دی گئی۔

حکومت چلانے کے اصولوں میں مشاورت پر مفصل بحث کی گئی ہے، اور ضمناً ''کثرتِ آراء کی بنیاد پر فیصلہ'' پر گفتگو کی گئی ہے۔ بطور نتیجہ لکھا گیا ہے کہ مباحات میں کثرتِ رائے پر فیصلہ کرنے کو ترجیح حاصل ہے۔ (دیکھیے: صفحات ۲۶۲-۲۶۶)

''اسلام اور سیاسی نظریات'' کے مطالعے سے واضح ہے کہ کتاب کا دوسرا حصہ زیادہ وقیع ہے، اور اِس میں نسبتاً زیادہ سوچ بچار اور گہرائی ہے جب کہ حصہ اوّل میں یہ بات نہیں۔ مثال کے طور پر حصہ اوّل میں ''بادشاہت'' کی اِس خصوصیت پر تو زور دیا گیا ہے کہ یہ شخصی حکومت ہوتی ہے، مگر یہ پہلو بالکل سامنے نہیں آیا کہ بادشاہت میں باپ کے بعد بیٹا اور بیٹے کے بعد پوتا، یا کم از کم ایک ہی خاندان کے افراد حکمران رہتے ہیں۔ حکمران کے نیک یا ظالم ہونے کی بنیاد پر ہی بادشاہت پر نقد نہیں کیا گیا، بلکہ انسانوں میں سے ایک طبقے کو اعلیٰ اور اکثریت کو ادنیٰ ماننے کے تصور پر بادشاہت قابلِ گرفت ہے۔ جناب عثمانی نے قرآن مجید میں طالوت، حضرت سلیمان اور حضرت داؤد کے لیے لفظ ''ملک'' کے استعمال کو اصطلاحاً قبول کیا ہے، اور یوں ملوکیت یا بادشاہت کے لے نرم گوشہ پیدا کیا ہے (صفحات ۲۹-۳۰)۔ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں ملوکیت نہیں ہے تو غالباً کہنے والے کی اِس سے مراد یہ ہوتی ہے کہ اسلام میں اختیارِ حکمرانی کسی ایک خاندان میں مرتکز نہیں۔ اِسی طرح جناب عثمانی نے ''تھیوکریسی'' کے لفظی مطلب ''خدا کی حاکمیت'' کے تحت یہ لکھا ہے:

(۳۰) ملاحظہ

Scanned by CamScanner

تھیوکریسی کا لفظ اب بہت بدنام ہوگیا ہے، اِس لیے ہمارے مسلمان معاشرے میں بھی لوگ بکثرت یہ کہنے لگے ہیں کہ اسلام تھیوکریسی کا حامی نہیں ہے، اور تھیوکریسی اسلام کے خلاف ہے، لیکن یہ کہتے وقت لوگ تھیاکریسی کے اصل تصور اور عیسائی دُنیا میں اس کے عملی اطلاق کے درمیان فرق نہیں کرتے۔---(ص ۳۴)

جناب عثمانی نے واضح کیا ہے کہ مغرب میں ''عملاً تھیوکریسی کا مطلب مذہبی پیشواوں کی حاکمیت [کا] ہوگیا، چنانچہ اب جو تھیوکریسی کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو بکثرت خدا کی حاکمیت کے بجائے 'مذہبی پیشواوں کی حاکمیت' کے لفظ سے کیا جاتا ہے۔''—جب یہ مفہوم بن گیا ہے تو یہ کہنے میں کیا برائی ہے کہ اسلام میں تھیوکریسی نہیں۔ مزید برآں کیتھولک مسیحیت میں الٰہیات سے واقفیت ہی کسی کے رائے دینے یا مذہبی رہنمائی کا فریضہ انجام دینے کے لیے کافی نہیں ہوتی، بلکہ پوپ کی جانب سے اُس کی ordination ضروری ہے۔ اسلام میں قرآن وسنت کے علم کی بنیاد پر کوئی مسلمان بھی رائے دینے اور بحث کرنے کا حق رکھتا ہے، اور عبادات میں امامت کا فریضہ ادا کرسکتا ہے۔ یہاں کسی مذہبی بزرگ یا رہنما کی تصدیق لازمی نہیں۔

علمائے کرام کی جانب سے رہنمائی میں جتنی clarity ہوگی، عامۃ المسلمین کے لیے اتنی ہی مفید ہوگی۔ ''لفظی'' مفہوم کے حوالے سے کسی ادارے کو صحیح یا غلط قرار دینے کے بجائے اس کی کارکردگی زیادہ اہم ہونا چاہیے۔

''اسلام اور سیاسی نظریات'' کی ورق گردانی کرتے ہوئے محسوس ہوتا ہے کہ بعض اطلاعات اور بیانات کے بارے میں زیادہ تحقیق نہیں کی جاسکی۔ افلاطون کی ''جمہوریہ'' کو بڑی ضخیم کتاب بتایا گیا ہے۔ (ص ۱۱)، اس کے انگریزی ترجمے کے صفحات ڈھائی تین سو کے لگ بھگ ہیں، اور کم وبیش اتنے ہی اُردو ترجمے کے۔ مزید کہا گیا ہے کہ ''جمہوریہ کا لفظ بھی سب سے پہلے افلاطون ہی نے

Scanned by CamScanner

استعمال کیا ہے'' (ص ۱۱)، حالانکہ افلاطون کی اِس کتاب کا یونانی نام *Politeia* یا *Polity* تھا، جسے انگریز مترجمن نے *Republic* بنا دیا، اور اِس سے اُردو مترجمین نے ''جمہوریہ'' - politeia کا مطلب دورِ حاضر کی جمہوری ریاست نہیں جس کے مخصوص تشکیلی عناصر ہیں، اور بادشاہت وغیرہ سے ممتاز ہے۔ جمہوریت، اشرافی حکومت یا بادشاہت سب کے لیے polity کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

نظریہ معاہدۂ عمرانی پیش کرنے والے مغربی مفکرین تھامس ہابز، جان لاک اور روسو تینوں کو فرانسیسی قرار دیا گیا ہے (ص ۱۹)، حالانکہ اول الذکر دو برطانوی تھے، البتہ روسو فرانس نژاد تھا۔ مزید برآں اول الذکر دو کے تصورِ معاہدہ کی تفصیلات میں کوئی فرق نہیں کیا گیا، جب کہ دونوں نے نظریے کو اپنے اپنے دور کے مختلف مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔ جن اہل علم نے فارابی کے حوالے سے نظریۂ معاہدہ عمرانی کے بارے میں گفتگو کی ہے وہ سرے سے زیر بحث ہی نہیں آ سکے۔

ہولوکاسٹ (Holocaust) کی تشریح ایک جگہ ''جرمنی سے اُن [یہودیوں] کے نکالے جانے'' سے کی گئی ہے (ص ۴۷)، حالانکہ Holocaust سے مراد دوسری عالمی جنگ میں یہودیوں کی مبینہ نسل کشی ہے، محض جلاوطنی نہیں۔ ایک جگہ انگریزوں کو سامی النسل قرار دیا گیا ہے (ص ۷۵)، قاضی ابویعلیٰ حنبلی کی کتاب کا نام ''ایساستہ الشرعیہ'' لکھا گیا ہے (ص ۲۰۳) آیا ابویعلیٰ کا نام سہوِ قلم ہے یا ''السیاستہ الشرعیہ'' کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اِسی طرح بعض دوسری جزئیات بھی نظرِ ثانی کی محتاج ہیں۔

مکتبہ معارف القرآن - کراچی نے کتاب سفید کاغذ پر شائع کی ہے، جلد مضبوط اور گرد پوش جاذبِ نظر ہے، مگر پروف خوانی میں تساہل برتا گیا ہے۔ امید ہے کہ دینی مدارس کے منتہی طلبہ ہی نہیں، سیاسیات کے عام طالب علم بھی کتاب سے استفادہ کریں گے۔

ادارہ

Scanned by CamScanner